ADVANCE SOCIAL SCIENCE ARCHIVE JOURNAL
Available Online: https://assajournal.com
Vol. 03 No. 02. April-June 2025.Page#.233-241
Print ISSN: 3006-2497 Online ISSN: 3006-2500
Platform & Workflow by: Open Journal Systems

An Analysis of Humanism and Realism in Manto's Short Stories

منٹو کے افسانوں میں انسانیت اور حقیقت نگاری کا جائزہ

Haleema Sadia
MA Urdu, International Islamic University Islamabad
haleemasadia.iiui@gmail.com
Safia Kaosar
Assistant Professor, Government Gordon Graduate College, Rawalpindi.
safiakaosar@gmail.com

Abstract
Saadat Hasan Manto, one of the most prominent short story and fiction writers in Urdu literature, is widely known for his unfiltered portrayal of society and deeply humanistic approach to storytelling. His fiction captures the raw realities of the human condition, often delving into themes of partition, sexuality, marginalization, and psychological trauma. This paper explores the intricate interplay of humanism and realism in Manto's short stories. Manto's realism is not limited to external events or historical occurrences but extends deeply into the psyche of his characters, who are often victims of societal hypocrisy, political turmoil, or internal moral conflict. Through stories such as *Khol Do*, *Thanda Gosht*, *Toba Tek Singh*, and *Bu*, Manto presents a world where the lines between right and wrong, virtue and vice, are blurred challenging the reader's moral framework. His humanism lies in his refusal to dehumanize his characters, even when they operate in morally ambiguous or socially condemned spaces. Women, prostitutes, refugees, lunatics, and the lower classes are not mere symbols in his work but complex human beings with agency and depth. This paper analyzes these themes from psychological and sociological perspectives, particularly through Freudian analysis and social realism. By doing so, it underscores Manto's unique contribution to literature as a truth-teller who believed in confronting society with its own reflection. His work remains deeply relevant in understanding the socio-political and moral crises of both his time and the present.

Keywords: Saadat Hasan Manto, Urdu Literature, Humanism, Realism, Partition, Psychological Analysis, Social Realism, Gender, Marginalization, Freudian Theory.

تعارف

سعادت حسن منٹو، بیسویں صدی کے اردو افسانے کے وہ مایہ ناز ادیب ہیں جنہوں نے اردو ادب کو ایک نیا زاویہ دیا۔ منٹو 11 مئی 1912ء کو لدھیانہ، پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک کشمیری مسلم خاندان سے تھا۔ والد ایک سخت گیر شخص تھے، جس کا اثر منٹو کی ابتدائی زندگی پر گہرا رہا۔ تعلیم کے سلسلے میں منٹو نے ایم۔اے اردو تک تعلیم حاصل کی لیکن باقاعدہ تعلیمی میدان سے زیادہ اُن کا جھکاؤ ادب اور فن کی طرف تھا۔ ان کا ادبی سفر 1933ء میں ترجمے سے شروع ہوا، جب انہوں نے وکٹر ہیوگو کا ناول "The Last Days of a Condemned" اردو میں "سرگزشت اسیر" کے نام سے ترجمہ کیا۔ جلد ہی وہ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستہ ہو گئے اور فلمی دنیا سے بھی تعلق رہا۔ لاہور واپسی کے بعد انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں

کا بھرپور استعمال کیا اور افسانہ نگاری کو اپنی شناخت بنایا۔ منٹو نے اپنے افسانوں کے ذریعے معاشرے کے وہ چہرے بے نقاب کیے جو بظاہر نظر نہیں آتے تھے، اور یہی خصوصیت ان کی شہرت کی بنیاد بنی۔[1]

منٹو کے افسانوں کی ادبی اہمیت ان کی حقیقت پسندی، نفسیاتی تجزیے اور معاشرتی مسائل کی جرات مندانہ عکاسی میں مضمر ہے۔ انہوں نے اردو افسانے کو محض رومانی و جذباتی بیانیے سے نکال کر ایک ایسا آئینہ بنایا جس میں انسانی المیے، جنسی ناہمواری، طبقاتی تفریق اور سیاسی منافقت کے عکس واضح نظر آتے ہیں۔ منٹو کے ہاں کردار، ماحول اور مکالمہ ایک خاص نوع کی صداقت اور بے باکی لیے ہوئے ہوتا ہے۔ ان کے افسانے "ٹھنڈا گوشت"، "کھول دو"، "ٹوبا"، "بو"، اور "کالی شلوار" محض فکشن نہیں بلکہ ایک عہد کی سماجی و نفسیاتی تاریخ ہیں۔ ممتاز نقاد ممتاز شیریں کے مطابق، منٹو نہ مرد ہے نہ عورت بلکہ انسان ہے، اور اس کی تحریر انسانی ضمیر کی تہوں کو چھونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔[2] منٹو نے جس طرح تقسیم ہند کے دوران پیش آنے والے تشدد، جبریت، اور نفسیاتی خلفشار کو بیان کیا، اس کی نظیر اردو ادب میں کم ہی ملتی ہے۔ انہوں نے افسانے کے فن میں علامتی اور حقیقی عناصر کو اس خوبصورتی سے سمویا کہ قاری چونک اٹھتا ہے۔[3]

اس تحقیقی مقالے کا مقصد سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں موجود انسانی المیوں اور حقیقت نگاری کے پہلوؤں کا گہرائی سے جائزہ لینا ہے۔ منٹو کے افسانے محض کسی واقعے کی روداد نہیں بلکہ انسانی شعور، لاشعور اور خارجی دنیا کے پیچیدہ رشتوں کی ترجمانی ہیں۔ ان کے ہاں حقیقت پسندی محض بیرونی مظاہر کی عکاسی نہیں بلکہ انسان کے باطن کی تفہیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے قاری کو صرف محظوظ نہیں کرتے بلکہ اسے جھنجھوڑتے بھی ہیں۔ منٹو نے نہ صرف سیکس اور جنسی نفسیات جیسے ممنوعہ موضوعات کو چھیڑا بلکہ سماجی روایات، مذہبی منافقت، اور طاقت کے مظالم کو بھی بے نقاب کیا۔[4] اس مقالے میں منٹو کی تحریروں کو نفسیاتی، سماجی اور فلسفیانہ زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی جائے گی، تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ انہوں نے انسانی المیے کو کس شدت، سچائی اور فنی مہارت سے بیان کیا۔[5] خاص طور پر سگمنڈ فرائیڈ کے نظریات کی روشنی میں منٹو کے کرداروں کا تجزیہ پیش کیا جائے گا، تاکہ ان کے باطن میں چھپے اضطراب، خواہشات اور محرکات کو سمجھا جا سکے۔[6]

منٹو کا فن اور حقیقت نگاری

منٹو کا فن اردو افسانے میں حقیقت نگاری کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ انہوں نے زندگی کے ان پہلوؤں کو موضوع بنایا جن سے اکثر ادیب، نقاد اور معاشرہ آنکھ چرانے کو ترجیح دیتے تھے۔ منٹو کے نزدیک ادب کا مقصد نہ تو صرف تفریح ہے، نہ ہی صرف اخلاقیات کی تبلیغ، بلکہ زندگی کو اس کے اصل روپ میں پیش کرنا ہے۔ ان کے نزدیک افسانہ محض اختراع نہیں بلکہ ایک داخلی سچائی کی خارجی تصویر ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اگر آپ میرے افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے"۔[7] یہی نظریہ ان کے حقیقت پسندانہ اسلوب کا بنیادی پتھر ہے۔ منٹو کا اندازِ تحریر سادہ مگر پراثر ہے، وہ علامتی زبان کے بجائے براہِ راست اور کُھری بات کرتے ہیں، جس سے ان کے افسانے قاری کے ذہن و دل میں گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔[8]

منٹو حقیقت کو صرف مشاہدے کی حد تک نہیں دیکھتے بلکہ اسے انسانی نفسیات، لاشعور اور جبلتوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "میں کسی کو پاک یا ناپاک نہیں سمجھتا، میرے نزدیک ہر انسان پہلے انسان ہے، بعد میں کچھ اور[9]"۔ اس تصورِ حقیقت میں جنس، مذہب، اخلاق اور

سماج سب ایک ایسی چھلنی سے گزرتے ہیں جس میں منافقت، جھوٹ اور معاشرتی ساخت کے اندر موجود استحصال کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ ان کے افسانے "ٹھنڈا گوشت"، "کالی شلوار"، "ہتک" اور "کھول دو" اس بات کی روشن مثالیں ہیں کہ منٹو نے کس طرح معاشرتی سچائیوں کو براہِ راست اور بے خوف انداز میں پیش کیا[10]۔ وہ حقیقت کو سنوارنے یا ڈھانپنے کے قائل نہ تھے بلکہ اسے جوں کا توں پیش کرنے کو ادبی دیانت داری سمجھتے تھے[11]۔

منٹو نے اردو افسانے میں ایک ایسا رجحان متعارف کروایا جسے سماجی تنقید، نفسیاتی کشمکش اور جنسی سچائیوں کی آمیزش کہا جا سکتا ہے۔ ان کے ہاں حقیقت نگاری ایک شعوری و فکری مزاحمت کا ذریعہ ہے، جس کا مقصد سماج کی منافقانہ تہذیب کو چیلنج کرنا اور ان آوازوں کو نمایاں کرنا ہے جو دبائی جاتی ہیں۔ منٹو نے کہا تھا: "مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ میرا فن قبول کیا جاتا ہے یا نہیں، مجھے صرف سچ بیان کرنا ہے"[12]۔ یہی "سچ" اُن کا ہتھیار بھی تھا اور ان کی شناخت بھی۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے نہ صرف عورت کی بے بسی، مرد کی جبلتی حاکمیت، بلکہ تقسیم ہند کے خونی فسادات جیسے تلخ حقائق کو اس طرح بیان کیا کہ قاری محض متاثر نہیں بلکہ بے چین ہو جاتا ہے۔[7] حقیقت کو جھوٹ، پردہ داری یا ادب کے جھوٹے لبادے میں لپیٹنے کے بجائے منٹو نے ننگی حقیقت دکھائی، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے دور کے سب سے متنازع اور سب سے معتبر افسانہ نگار بن کر ابھرے[13]۔

منٹو کے افسانوں میں انسانیت کا تصور

سعادت حسن منٹو کے افسانوں کا سب سے اہم اور نمایاں پہلو "انسانیت" ہے۔ وہ مظلوم طبقے، استحصال زدہ افراد، عورتوں، طوائفوں، پاگلوں، پناہ گزینوں اور تقسیمِ ہند کے متاثرین کو نہ صرف اپنی کہانیوں کا موضوع بناتے ہیں بلکہ ان کے دکھ کو اپنی زبان عطا کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب کا اصل فریضہ انسانی درد کو بیان کرنا ہے۔ ''کھول دو'' میں سکینہ کا کردار ایک گونگی چیخ ہے جو فسادات کی ہولناکی کو بیان کرتا ہے؛ جسمانی زیادتی کا شکار ہونے کے باوجود سکینہ کا باپ کو پہچاننا اور "دروازہ کھول دینا" انسانیت کی روح کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ ''ٹھنڈا گوشت'' میں ایشر سنگھ کی بے حسی اور عورت کی لاش سے جنسی تسکین کا تصور صرف اخلاقی پستی کا نہیں بلکہ انسان کی اندھی جبلت کا استعارہ ہے۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' میں بشن سنگھ کی پاگل پن دراصل تقسیم ہند کی غیر انسانی سیاست پر ایک بھرپور طنز ہے، جس میں انسان کا نہ تعلق بچتا ہے، نہ شناخت[14]۔

منٹو کے افسانے نہ صرف سماجی حقائق کا آئینہ ہیں بلکہ انسانی نفسیات کی تہوں میں بھی جھانکتے ہیں۔ ان کے کرداروں کی داخلی کشمکش، خواہشات اور خوف ایک پیچیدہ مگر حقیقت پسند دنیا کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ''بابو گوپی ناتھ'' میں زینت کی بے بسی ایک عورت کے جنسی اور جذباتی استحصال کی نمائندہ ہے، جہاں ایک "مہذب" بابو کے پیچھے چھپا حیوان نظر آتا ہے[15]۔ اسی طرح ''نیا قانون'' میں منگو کوچوان کی معصوم خوشی اور اچانک مایوسی ہمیں دکھاتی ہے کہ کس طرح عام آدمی کو نئے قوانین، آزادی یا حکومتوں سے امیدیں تو وابستہ ہوتی ہیں، لیکن انجام ہمیشہ دھوکے پر ہوتا ہے۔ منٹو نفسیات کو نہ صرف موضوع بناتے ہیں بلکہ اسے کہانی کے تانے بانے میں یوں سمو دیتے ہیں کہ قاری کرداروں سے جُڑ جاتا ہے۔ وہ کرداروں کو معصوم یا مجرم نہیں بناتے بلکہ انسان کے طور پر دکھاتے ہیں، جن کے اندر نیکی اور بدی دونوں کا امکان موجود ہے[16]۔

انسانی ہمدردی منٹو کی تحریروں کی اصل روح ہے۔ وہ اخلاقیات کا پرچار نہیں کرتے بلکہ اخلاقیات کے نقاب کو اتارتے ہیں تاکہ اصل چہرہ دکھایا جا سکے۔ ان کے کردار اکثر گناہگار ہوتے ہیں، مگر وہ گناہ کو سماجی جبر، معاشی استحصال اور نفسیاتی دباؤ کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ منٹو کے نزدیک طوائف صرف ایک جسم فروش نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی، حساس، مجبور عورت ہے جو خود بھی ظلم کا شکار ہے[17]۔ اسی طرح مذہب، قوم، اور ذات کے نام پر کی جانے والی تقسیمیں انہیں کبھی قابلِ قبول نہیں رہیں۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کے ذریعے وہ بتاتے ہیں کہ جب مذہب اور شناختیں انسانیت پر غالب آ جاتی ہیں، تو نتیجہ پاگل پن کی صورت نکلتا ہے۔[8]منٹو کے افسانے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ جرم کرنے والا شخص ہمیشہ مجرم نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات وہ خود بھی کسی بڑے جرم کا شکار ہوتا ہے۔ یہی انسانی گہرائی منٹو کو دوسروں سے ممتاز بناتی ہے[18]۔

حقیقت نگاری کے تناظر میں تنقید اور اعتراضات

منٹو کی حقیقت نگاری نے جہاں اردو افسانے کو نئی بلندیوں تک پہنچایا، وہیں ان پر "فحش نگاری" کے شدید الزامات بھی لگے۔ ان کے کئی افسانوں جیسے "ٹھنڈا گوشت"، "بو"، "کالی شلوار"، اور "کھول دو" کو عدالتوں میں فحاشی کے الزام میں پیش کیا گیا19۔ منٹو نے ان مقدمات کا نہ صرف قانونی بلکہ فکری و تخلیقی انداز میں دفاع کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ "اگر میری تحریریں فحش ہیں تو معاشرہ جس کی عکاسی کرتی ہیں وہ کہیں زیادہ فحش ہے"۔ ان کا یہ جملہ مشہور ہے: "میں سچ لکھتا ہوں اور وہ سچ ہی اگر فحش ہے تو میرے بس کی بات نہیں[20]۔" منٹو کے لیے فحاشی کوئی ادبی مقصد نہ تھی بلکہ وہ انسانی سچائیوں کو عریاں کرنے پر یقین رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک جھوٹے پردوں میں لپٹی ہوئی اخلاقیات سے بہتر ہے کہ سچ کو جیسا ہے ویسا ہی پیش کیا جائے۔

منٹو کی حقیقت نگاری پر اعتراض کرنے والے اکثر وہ لوگ تھے جو معاشرتی منافقت کا شکار تھے۔ منٹو نے اپنے ایک مضمون میں لکھا: "اگر ویشیا کا ذکر فحش ہے تو اس کا وجود بھی فحش ہے[21]۔" ان کے افسانوں میں جنسی موضوعات ضرور شامل ہوتے تھے، مگر ان کا مقصد قاری کو جسمانی کشش دینا نہیں بلکہ ذہنی جھٹکا دینا تھا تاکہ وہ سوچنے پر مجبور ہو جائے۔ "ٹھنڈا گوشت" میں جنسی تشدد کے ذریعے معاشرتی وحشت کو اجاگر کیا گیا، نہ کہ جنسی لذت کو22۔ منٹو نے معاشرے کی ان پرتوں کو نمایاں کیا جنہیں "مہذب لوگ" نظر انداز کرتے ہیں۔ وہ کہتے تھے: "میں ان سچائیوں کو بیان کرتا ہوں جن سے سماج نظریں چرا لیتا ہے[23]۔"

ادب اور اخلاقیات کے درمیان کشمکش میں منٹو ہمیشہ ادب کے حق میں کھڑے رہے۔ ان کے نزدیک ادب کا کام "اخلاق سکھانا" نہیں بلکہ "سچ دکھانا" تھا۔ وہ لکھتے ہیں: "ادب کوئی مدرسہ نہیں جو اخلاقیات کی تعلیم دے، بلکہ یہ زندگی کی عکاسی کرتا ہے، خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو24۔" یہی وجہ ہے کہ منٹو کے افسانے اکثر متنازع ٹھہرتے، مگر وقت نے ثابت کیا کہ ان کی حقیقت نگاری محض فحش نگاری نہیں بلکہ ایک درد مند دل کی سچی آواز تھی۔ ان کے کردار مجرم نہیں بلکہ مظلوم ہوتے ہیں، جو خود نظام اور معاشرتی ڈھانچوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ منٹو کا دفاع صرف الفاظ میں نہیں بلکہ تخلیقی قوت میں بھی نظر آتا ہے۔ انہوں نے خطوط، مضامین اور خودنوشت میں اپنی زندگی کے دکھ، تضحیک اور الزامات کے باوجود حق گوئی نہیں چھوڑی۔ "منٹو کا انکار"، "سیاہ حاشیے" اور ان کے دیگر مجموعے اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ "اخلاقی پولیس" کے خلاف ایک فردِ واحد کی لڑائی لڑ رہے تھے[25]۔ وہ کہتے ہیں: "میں تہذیب کے دوغلے پن کے خلاف ہوں، جو ایک طرف عورت کے جسم

کو قابلِ فروخت بناتا ہے اور دوسری طرف اسے حیاکا پردہ اوڑھنے کا حکم دیتا ہے[26]۔"ان کی حقیقت نگاری، انکار، اور بے باک قلم آج بھی ادب میں صداقت کی علامت ہے، اور ان کے ناقدین وقت کے ساتھ خاموش ہوتے گئے۔

منٹو کے افسانوں میں تاریخی اور سماجی حقیقت

منٹو کے افسانے محض تخیلاتی یا جذباتی کہانیاں نہیں بلکہ اپنے عہد کے تاریخی حقائق کی عکاسی کرتے ہیں۔ خاص طور پر تقسیمِ ہند کے المیے کو انہوں نے انسانی جذبات کی زبان میں بیان کیا۔ افسانہ "کھول دو" میں سکینہ کی بے حسی اور اذیت جس انداز سے بیان ہوئی ہے، وہ تقسیم کے بعد ہونے والے جنسی تشدد کا زندہ ثبوت ہے[28]۔"ٹوبہ ٹیک سنگھ" میں بٹوارے کی غیر معقولیت اور پاگل پن کے ذریعے منٹو نے بتایا کہ اس بٹوارے نے انسانوں کو زمینوں سے نہیں، جذبات سے کاٹا[29]۔"گورمکھ سنگھ کی وصیت" میں فرقہ واریت کے خلاف امن اور انسانیت کی آواز بلند کی گئی، جو اس عہد میں ایک نایاب جذبہ تھا۔ منٹو نے تاریخ کو محض واقعات کی فہرست نہیں بنایا، بلکہ اس کے اثرات کو انسانی چہروں پر نمایاں کیا۔

منٹو کی حقیقت نگاری صرف تقسیم تک محدود نہیں تھی۔ انہوں نے استعماری دور کے مظالم کو بھی بے نقاب کیا۔"تماشا" ایک بچے کی آنکھوں سے جلیاں والا باغ کے قتلِ عام کی منظر کشی ہے، جو نہ صرف ظلم کی شدت کو دکھاتا ہے بلکہ ذہنی صدمے کو بھی اجاگر کرتا ہے[30]۔"1919 کی بات" میں عوامی بغاوت اور انگریزوں کے جبر کا بیان جذباتی بھی ہے اور سیاسی شعور پیدا کرنے والا بھی۔ منٹو نے انگریز راج کے اس دور کو محض بیرونی طاقت کی حکمرانی نہیں سمجھا، بلکہ اسے ایک انسانی المیہ قرار دیا جس میں انگریز تو ظالم تھے ہی، مگر بعض ہندوستانی بھی اس ظلم کے شریک تھے۔ ان افسانوں میں آزادی کی تحریک کے وہ پہلو سامنے آتے ہیں جو تاریخ کی کتابوں میں اکثر غائب ہوتے ہیں۔

منٹو نے اپنی حقیقت نگاری میں سماجی ناانصافی اور طبقاتی تفریق کو خاص طور پر موضوع بنایا۔"نیا قانون" میں ایک عام آدمی کی مایوسی اور نیا قانون کے خواب کا ٹوٹنا اس سچائی کو اجاگر کرتا ہے کہ قوانین صرف طاقتور طبقے کے لیے ہوتے ہیں[31]۔"سڑک کے کنارے" جیسے افسانے میں مزدور، فٹ پاتھ پر سوتے لوگ، اور چھوٹے طبقے کے کرداروں کے ذریعے منٹو نے بتایا کہ ترقی کا شور صرف شہر کے بورڈوں تک محدود ہوتا ہے، حقیقی زندگی میں غربت، بھوک اور ناانصافی اپنی جگہ قائم رہتی ہے[32]۔ منٹو کے لیے معاشرتی حقیقتوں کو بیان کرنا صرف ادبی مشق نہیں بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری تھی، اور یہی وہ پہلو ہے جو ان کو اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔

منٹو کا اسلوب اور فنکارانہ خصوصیات

منٹو کے اسلوب کا سب سے نمایاں وصف اُن کے مختصر اور اثر انگیز مکالمے ہیں۔ وہ الفاظ کا انتخاب نہایت چابک دستی سے کرتے تھے، اور ان کے مکالمے بسا اوقات پوری کہانی کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا لیتے ہیں۔"ٹھنڈا گوشت" میں موجود مختصر جملے نہ صرف کردار کی ذہنی حالت کو آشکار کرتے ہیں بلکہ قاری کے دل پر چوٹ بھی لگاتے ہیں33۔ منٹو کا ماننا تھا کہ زندگی مختصر ہے اور اسے مختصر جملوں میں ہی بیان کیا جانا چاہیے، اسی لیے وہ طویل بیانیہ سے گریز کرتے تھے اور مکالمے کے ذریعے کرداروں کے احساسات اور صورت حال کو اجاگر کرتے تھے34۔ ان کے مکالمے زندگی کے قریب اور روزمرہ زبان سے قریب تر ہوتے تھے، جو افسانے کو حقیقت سے جوڑ دیتے تھے۔

منٹو کے فن میں ایک اور انفرادیت کرداروں کی غیر روایتی پیشکش ہے۔ انہوں نے ہیرو کے تصور کو رد کر کے عام انسان کو مرکز میں رکھا۔ ان کے کردار نہ مکمل نیک ہوتے ہیں نہ مکمل برے، بلکہ انسانی تضادات سے بھرپور ہوتے ہیں۔ مثلاً "بابو گوپی ناتھ" میں ایک طوائفوں کا دل جیتنے والا مرد دکھایا گیا ہے، جو بظاہر رنگین مزاج ہے مگر اس کے اندر ہمدردی اور انسانیت بھی ہے[35]۔ اسی طرح "سڑک کے کنارے" کا مزدور، یا "نیا قانون" کا منگو کوچوان، سبھی وہ کردار ہیں جنہیں عموماً افسانوی ادب میں نظر انداز کیا جاتا ہے[36]۔ منٹو نے انہیں وہ آواز دی جو سماج نے چھین لی تھی۔ ان کے کردار جیتے جاگتے انسان ہوتے ہیں، جو غلطیاں کرتے ہیں، خواب دیکھتے ہیں، اور ٹوٹتے ہیں۔

منٹو کے افسانوں میں طنز و مزاح بھی ایک مضبوط عنصر کے طور پر موجود ہے، جو بظاہر کہانی کو ہلکا پھلکا بناتا ہے مگر درحقیقت سماجی نکتہ چینی کا گہرا پہلو رکھتا ہے۔ "نیا قانون" میں منگو کوچوان کا یہ گمان کہ انگریزوں کا دور ختم ہو گیا ہے، طنزیہ پیرائے میں پیش کیا گیا، جو نہ صرف قاری کو ہنساتا ہے بلکہ مایوسی کا احساس بھی جگاتا ہے[37]۔ منٹو کا طنز کبھی کبھی اتنا تلخ ہو جاتا ہے کہ وہ سماجی اقدار کو ننگا کر کے رکھ دیتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ "ہم جنہیں تہذیب کہتے ہیں، اکثر وہ محض پردہ پوشی ہوتی ہے"[38]۔ طنز منٹو کے لیے اصلاح کا ہتھیار بھی تھا اور انسانی منافقتوں کو بے نقاب کرنے کا ذریعہ بھی۔ منٹو کا اسلوب مجموعی طور پر نہایت براہِ راست، بے باک اور سادہ ہے، جو قاری کو محض قائل نہیں کرتا بلکہ جھنجھوڑتا بھی ہے۔ انہوں نے بیانیہ کو اختصار کے ساتھ استعمال کیا، اور کہانی کو غیر ضروری تفصیلات سے آزاد رکھا۔ اسلوب کی یہ سادگی دراصل ان کی فکری گہرائی کو زیادہ نمایاں کرتی ہے۔ ان کے افسانے بار بار پڑھے جا سکتے ہیں اور ہر بار قاری کو ایک نیا زاویہ دکھاتے ہیں۔ یہی وہ فن ہے جو منٹو کو ایک منفرد اور لازوال افسانہ نگار بناتا ہے۔ ان کے اسلوب کی جرات مندی نے اردو ادب کو نئی راہیں دکھائیں اور قاری کو ادب سے مکالمے کی عادت دی۔

ناقدین کی آراء

منٹو کے فن پر کئی اہم نقادوں نے اپنی آراء پیش کی ہیں، جن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا نام نمایاں ہے۔ نارنگ صاحب کے مطابق، منٹو نے اردو افسانے کو ایک نیا زاویہ دیا جہاں کہانی محض بیان نہیں بلکہ انسانی جذبات کی پیچیدگیوں کا اظہار بن گئی۔ وہ لکھتے ہیں: "منٹو کا فن انسانی تجربے کی شدت اور سچائی کا آئینہ ہے، جس میں ظاہری زندگی سے زیادہ اندرونی کیفیات کی جھلک ملتی ہے"[39]۔ وہاب اشرفی نے منٹو کو "انسانی نفسیات کا ماہر" قرار دیا، اور ان کی حقیقت نگاری کو ایسا عمل قرار دیا جو ادب کو نئے معنی دیتا ہے۔ وقار عظیم بھی منٹو کی تحریر کو ایک دلیرانہ اظہارِ سچائی مانتے ہیں، جو سماج کے ان گوشوں کو روشن کرتا ہے جنہیں دوسرا ادب نظر انداز کرتا رہا ہے[40]۔

منٹو کا تعلق بظاہر ترقی پسند تحریک سے تھا، لیکن وہ ہمیشہ خود کو کسی مکتبِ فکر سے وابستہ ماننے کے بجائے آزاد لکھاری سمجھتے رہے۔ خلیل الرحمن اعظمی نے لکھا کہ منٹو نے ترقی پسند تحریک کے مقاصد کو فنکارانہ سطح پر زیادہ اثر انگیز انداز میں پیش کیا، مگر وہ نظریاتی وابستگی کے بجائے انسان کے دکھ درد کو اپنا موضوع بناتے تھے[41]۔ منٹو نے خود بھی کہا تھا کہ "میں ادب کو ادب کی خاطر نہیں بلکہ انسان کی خاطر لکھتا ہوں"۔ ترقی پسندوں کے نزدیک وہ ایک حساس دل رکھنے والے لکھاری تھے، جس نے ظلم، استحصال اور طبقاتی تفریق کو بڑی بے باکی سے پیش کیا۔ نقادوں کے مطابق منٹو کی حقیقت نگاری دراصل ایک انسان دوست بیانیہ ہے۔ وہ حقیقت کو بیان کرنے میں نہ تو ڈرتے ہیں اور نہ ہی اسے سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ممتاز شیریں لکھتی ہیں کہ "منٹو کے یہاں زندگی کے ہر پہلو کی نمائندگی ہے، وہ کہانی کو خوبصورت بنانے کے بجائے سچا بنانے پر یقین رکھتا ہے"۔

اسی طرح ڈاکٹر وزیر آغا نے منٹو کو اردو افسانے میں "حقیقت پسندی کا امام" قرار دیا، جنہوں نے ادب کو سماجی شعور سے جوڑا۔ ان آراء سے ظاہر ہوتا ہے کہ منٹو کا فن وقتی نہیں بلکہ مسلسل تحقیق و تنقید کا مرکز ہے۔

منٹو کی تحریریں آج بھی نہ صرف اردو ادب بلکہ عالمی سطح پر سماجی حقیقت نگاری کی اعلیٰ مثال مانی جاتی ہیں۔ جہاں ایک طرف ان پر فحش نگاری کے الزامات لگے، وہیں دوسری جانب ان کے مداحوں نے انہیں جرات مند، حساس، اور انسان دوست لکھاری کہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی جب سماجی حقیقتوں پر مبنی ادب کی بات کی جاتی ہے تو منٹو کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ ان کی حقیقت نگاری نے قاری کو صرف ایک کہانی سنانے کے بجائے خود اُس کہانی کا حصہ بنا دیا، جو ایک عظیم فنکار کی پہچان ہے۔

اختتام

سعادت حسن منٹو اردو ادب کی تاریخ میں ایک ایسا نام ہے جو ہمیشہ بحث و تنقید کا مرکز رہا ہے۔ ان پر "فحش نگار" ہونے کے الزامات لگے، عدالتوں میں پیشیاں ہوئیں، اور ان کے افسانوں کو متنازعہ قرار دیا گیا۔ مگر جب ہم ان کے افسانوں کو غیر جانبدار ہو کر پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ منٹو در حقیقت ایک بے باک اور حساس حقیقت نگار تھے۔ ان کا قلم ان پہلوؤں کو بھی چھوتا ہے جن سے اکثر ادب دان گریز کرتے ہیں۔ منٹو نے خود اپنے دفاع میں کہا: "اگر میری تحریریں فحش ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ معاشرہ فحش ہے"۔ اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ منٹو کا مقصد فحاشی نہیں بلکہ حقیقت نگاری تھی، خواہ وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ منٹو کے افسانے آج کے دور میں بھی اپنی معنویت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ جب ہم موجودہ معاشرتی مسائل جیسے طبقاتی تفریق، عورتوں پر تشدد، نفسیاتی دباؤ، اور مذہبی منافرت کو دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ منٹو کا کلام آج بھی ایک آئینہ ہے جو سماج کے چہرے کو بے نقاب کرتا ہے۔ "کھول دو" اور "ٹوبہ ٹیک سنگھ" جیسے افسانے صرف تقسیمِ ہند کی تاریخ نہیں سناتے بلکہ آج کی دنیا میں پناہ گزینوں، اقلیتوں اور ذہنی مریضوں کے مسائل کی علامت بن چکے ہیں۔ منٹو کی تحریریں محض تاریخی اہمیت نہیں رکھتیں بلکہ وہ عصرِ حاضر کی سچائیوں کو بھی بے نقاب کرتی ہیں۔

منٹو کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے "ادب برائے ادب" یا "ادب برائے سیاست" کے بجائے "ادب برائے انسان" کو ترجیح دی۔ ان کے کردار عام لوگ تھے، مگر ان کے دکھ اور مسائل غیر معمولی تھے۔ منٹو کا فن ایک مسلسل احتجاج ہے، معاشرے کے تضادات اور منافقتوں کے خلاف۔ ان کے افسانوں میں نہ صرف استحصال کی کہانی ملتی ہے بلکہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بھی سنائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کا فن آج بھی قاری کو جھنجھوڑ دیتا ہے، اور اسے اپنے گرد و پیش کے حالات پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ آخر میں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ منٹو نہ صرف اردو ادب کے ایک نمایاں افسانہ نگار تھے، بلکہ وہ انسانیت کی آواز بھی تھے۔ ان کے افسانے ہمیں سکھاتے ہیں کہ ادب صرف دل بہلانے یا خواب دکھانے کا ذریعہ نہیں بلکہ وہ سماج کی جراحتوں کو ظاہر کرنے اور بہتر دنیا کی امید جگانے کا وسیلہ بھی ہو سکتا ہے۔ منٹو کے الفاظ آج بھی زندہ ہیں کیونکہ وہ انسانیت کے جذبات، درد اور سچائیوں کو بے لاگ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ منٹو صرف ماضی کا لکھاری نہیں بلکہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم آج بھی اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔

حوالاجات

1. دانش علی،(ترتیب وتدوین)،"نامور منٹو"،لاہور:بک ایج پبلی کیشنز،2016،ص:47۔
2. شمیم حنفی،"کہانی کے پانچ رنگ"،لاہور:نگارشات،1986،ص:47۔
3. دانش علی،(ترتیب وتدوین)،"منٹو کا انکار"، محولہ بالا،ص:100۔
4. لین یوتانگ،"جینے کی اہمیت"،(مترجم)مختار صدیقی،اسلام آباد،نیشنل بک فاؤنڈیشن،2017ء،ص:۱۲۱۔
5. سعادت حسن منٹو،"منٹوراما"،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2015ء،ص:733۔
6. ساجدہ زیدی،"انسانی شخصیت کے اسرار ورموز"، نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،1999،ص:430۔
7. سعادت حسن منٹو،"منٹوراما"، محولہ بالا،ص:730۔
8. سعادت حسن منٹو،"منٹونامہ"،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2007ء،ص:342۔
9. سگمنڈ فرائیڈ،"فرائیڈ کے مضامین"،(مترجم)ڈاکٹر ثوبیہ طاہر،لاہور،نگارشات،2017ء،ص:۱۸۱۔
10. ممتاز شیریں،"منٹو نوری نہ ناری"،کراچی،شہرزاد،2004ء،ص:52۔
11. سعادت حسن منٹو،"منٹونامہ"، محولہ بالا،ص:534۔
12. سگمنڈ فرائیڈ،"فرائیڈ کے مضامین"،(مترجم)ڈاکٹر ثوبیہ طاہر، محولہ بالا،ص:211۔
13. سعادت حسن منٹو،"بادشاہت کا خاتمہ"،دہلی:ساقی بک ڈپو،1985ء،ص:40۔
14. سعادت حسن منٹو،"منٹونامہ"، محولہ بالا،ص:653۔
15. سعادت حسن منٹو،"منٹوراما"، محولہ بالا،ص:820-819۔
16. ایضاً،ص:756۔
17. سعادت حسن منٹو،"منٹونامہ"، محولہ بالا،ص:262۔
18. ڈیسمنڈ مورس،"عورت،مرد اور تاریخ"،(مترجم)ارشد رازی،لاہور:نگارشات،2017ء،ص:۱۲۱۔
19. "اوکسفرڈ ڈکشنری آف سائیکالوجی"،اینڈریو ایم کالمن،نیویارک،اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس،2015ء،ص:668۔
20. سعادت حسن منٹو،"منٹونامہ"، محولہ بالا،ص:313-312۔
21. حمیرہاشمی ودیگر،"نفسیات"،لاہور:اردو سائنس بورڈ،2013ء،ص:755۔
22. ڈاکٹر گوپی چند نارنگ،"اردو افسانہ روایت اور مسائل"،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2012ء،ص:233۔
23. سعادت حسن منٹو،"منٹوراما"، محولہ بالا،ص:۱۸۲۔181۔
24. سعادت حسن منٹو،"منٹونامہ"، محولہ بالا،ص:۲۰۲۔
25. شہزاد احمد،"ژونگ نفسیات اور مخفی علوم"،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2010ء،ص:76۔
26. غلام حسین اظہر،"اردو افسانہ کا نفسیاتی دبستان"،مشمولہ "اوراق افسانہ نمبر"،دسمبر جنوری70-1969ء،لاہور،ص:57۔
27. سعادت حسن منٹو،"منٹونامہ"، محولہ بالا،ص:483۔

28. سگمنڈ فرائیڈ، ''فرائیڈ کے مضامین''، (مترجم) ڈاکٹر ثوبیہ طاہر، محولہ بالا، ص:87۔

29. سعادت حسن منٹو، منٹو نامہ، محولہ بالا، ص:287۔

30. دانش علی، (ترتیب و تدوین)، ''منٹو کا انکار''، محولہ بالا، ص:150۔

31. ڈاکٹر سلیم اختر، ''عورت جنس کے آئینے میں''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 1996ء، ص:164۔

32. ایضاً، 172۔171۔

33. ڈاکٹر ساجدہ زیدی، ''انسانی شخصیت کے اسرار و رموز''، محولہ بالا، ص:387۔

34. سعادت حسن منٹو، ''منٹو نامہ''، محولہ بالا، ص:687۔

35. سعادت حسن منٹو، ''منٹو راما''، محولہ بالا، ص:860۔

36. وارث علوی، ''ہندوستانی ادب کے معمار، سعادت حسن منٹو''، نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، 1995ء، ص:57۔

37. ایروخ فرام، ''محبت کا نظریہ''، (مترجم) شاہد حمید، مشمولہ ''کہانی گھر''، شمارہ نمبر ۵، لاہور: 2014ء، ص:27۔26۔

38. دانش علی، (ترتیب و تدوین)، ''منٹو کا انکار''، محولہ بالا، ص:144۔

39. سعادت حسن منٹو، ''منٹو نامہ''، محولہ بالا، ص:282۔

40. ڈاکٹر وزیر آغا، ''نئے مقالات''، لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، 2012ء، ص:105۔

41. سعادت حسن منٹو، ''منٹو نامہ''، محولہ بالا، ص:216۔